پاکستان میں عورت کی خانگی زندگی: مسائل اور امکانات اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

*روبینہ ترین
**حافظ حامد علی اعوان

Abstract

In this article the social and cultural status of women of Pakistan has been discussed,who have been given high hopes through religion,modern political thought or social movements of emancipation yet being exploited in the names of social conventions and customs.She is facing the balatant denial of equal status in spite of representation in democratic institutions.Media has high lighted some of the excesses meted out to women, yet a lot is needed to be done. At the end all these highlighted cases can be solved under the light of Islam.

تعارف:

آج ہمارے سماج میں عورت کی پہچان اور مقام و مرتبے کے حوالے سے پچھلے وقتوں کی نسبت بہت کچھ طے شدہ نظر آتا ہے۔ معاشرے کے مہذب، روشن خیال اور ترقی یافتہ ہونے کے معیارات کی اساس سوچ میں عورت کی طرف ہمارا رویہ بہت اہم شمار ہوتا ہے۔ یہ رویہ ہمیشہ سے ایسا اہم نہیں رہا تھا جیسا اکیسویں صدی کے سماج اور بالخصوص مشرقی سماج میں نظر آنے لگا ہے بلکہ اس میں بڑی حد تک تبدیلی لانے میں اسلام کا بھی مرکزی کردار ہے۔ امام بخاری نے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مکہ میں ہم لوگ عورتوں کو بامشکل پیچ سمجھتے تھے۔ مدینہ میں نسبتاً ان کی قدر تھی لیکن جب اسلام آیا اور خدا نے ان کے متعلق آیتیں نازل کی تو ہم کو ان کی قدر و منزلت معلوم ہوئی۔(1)

اسلام نے صرف یہ نہیں کیا کہ عورتوں کے صرف چند حقوق متعین کر دیے بلکہ ان کو مردوں کے مساوی درجہ دے کر مکمل انسانیت قرار دیا صحیح بخاری میں ہے کہ:

*ڈین، کلیہ علوم اسلامیہ ولسانیات، چیئرپرسن، شعبہ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان۔
لیکچرار، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی ملتان۔

"الرجل راع علی اهله وهو مسئول والمراۃ راعیة بیت زوجها وهی مسئوله"(2)

''مرد اپنے اہل کا راعی بنایا گیا ہے اور اس سے ان کے متعلق جواب طلب ہوگا اور عورت شوہر کے گھر کی راعیہ ہے اس سے اس کے متعلق باز پرس ہوگی''۔

اس بناء پر اسلام میں عورت کی جو منزلت قائم ہوئی وہ بلحاظ نتائج دیگر اقوام و مذاہب سے مختلف تھی اس کے ساتھ خود عورت کی مسلسل جدوجہد بھی شامل ہے جو معاشرے میں مردوں کی نام نہاد برتری کے خلاف وہ ایک مدت سے کر رہی تھی۔ اس تبدیلی کو بہر کیف ہم پورے سماج کی سوچ پر منطبق نہیں کر سکتے کیونکہ سماجی ترقی کے باوجود آج بھی کچھ جگہوں پر عورت اپنی خانگی زندگی اور معاشرتی سطح پر بہت سے تعصّبات کی گونج رسوم و رواج میں، قوانین اور معاشرتی رویوں میں گھری ہوئی دکھائی دیتی ہے اور اس کے بہت سے نقوش ہماری ادبی روایت پر بھی نظر آتے ہیں۔ شعر و ادب میں اس کو ہم تین سطحوں پر دیکھ سکتے ہیں ایک تو وہ عورت جو تخلیق کار تھی اور ہے، اسے اپنی شناخت منوانے کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑے اور کیا کیا اضافی کاوشیں کرنا پڑ رہی ہیں، دوسرے وہ عورت جس کو مردانہ منشا کے مطابق نگار خانۂ ادب کا دل آویز نقش بنایا گیا، کبھی وسیلۂ ترغیب کے طور پر، کبھی سامانِ دل بستگی کے لیے اور کبھی توشہ خانے کی زینت کے لیے اور پھر انہی تعصّبات کے تحت بلندیوں کے طے کردہ معیارات کے مطابق اپنے خیال میں 'پستیوں' میں گرا کر دغا بازی، فریب کاری اور بے وفائی کی تجسیم قرار دے دیا اور تیسری سطح پر وہ عورت دکھائی دیتی ہے (جس نے معاشرے کے بنے بنائے) جو سپر ایغو یا سماج کے بالائی ڈھانچے یا نام نہاد اشرافیہ کے بنائے ہوئے رسم و رواج، قوانین اور دھرم کی بنیادوں کو للکارا تو اسے جادوگرنی، گمراہ اور غدار کہہ کر مٹانے کی کوشش کی گئی جس سے وہ اور زیادہ نکھری اور نہ صرف نسائیت کی تحریک کے لیے رہنما ستارہ بنی بلکہ ادب و شعر میں صوفیا کے فرقۂ ملامتیہ کی صف میں شامل ہو کر ہمیشہ کے لیے ذہنی و جذباتی طور پر فیض رساں بن گئی۔ شعر و ادب میں عورت کے یہ تمام رُوپ مختلف بیانیوں میں سمو کر پیش کیے گئے ہیں اور ادبی تنقید کی روایت میں اسے فیمنزم کا نام دیا گیا۔ فرنچ تھیوری اسے 'فیمینن رائٹنگ' کا نام بھی دیتی رہی:

> 'Feminine Writing' (the French language makes no distinction between the English 'Fiminine' and 'female') can exist in women's present and potential creation; indeed women have an especial interest in

the disturbance of binary catagories that 'fiminine writing' enacts."(3)

تانیثیتی مطالعہ کوموضوع سے دخل ہے نہ کہ لکھاری سے، اس تھیوری میں اکثر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ خواہ کسی بھی موضوع پر کوئی تحریر ہو لیکن لکھاری عورت ہو حالانکہ عورت کی سماجی زندگی کے موضوع پر کسی مرد لکھاری کی بھی کوئی تحریر اس ادبی تھیوری کے دائرہ کار میں آسکتی ہے۔شعروادب میں عورت کے خانگی حالات کو موضوع بنانے والوں نے اسے ہمیشہ سماجیات سے ملا کر دیکھا ہے۔سماجی تعلقات بڑی حد تک انسانی ضروریات پر مبنی ہوتے ہیں،عورت کا اپنے سماج اور بالخصوص مرد سے رشتہ بھی دراصل انہی ضروریات کے ضمن میں آتا ہے گویا عورت اور مرد کے درمیان معاشی، سیاسی اور صنفی مساوات کی بات کرتے ہوئے تاریخی حقائق کو مدنظر رکھیں تو ہم جانتے ہیں کہ مرد اپنی جسمانی طاقت،نفسیاتی، سماجی، معاشی اور سیاسی حیثیت کی فوقیت کے احساس میں مبتلا ہے اور یہی احساس معاشرے میں اس کا کردار متعین کرتا ہے۔معاشرے کے سماجی تصورات بھی اس کے مطابق منعکس ہوتے ہیں:

''سماجی تعلقات کا تانا بانا پوری احتیاجی زندگی پر محیط ہے۔افراد تعلقات کے خالق بھی ہیں اور پروردہ بھی۔ یہ تعلقات اجرائے حیات کے لیے لازمی ہیں۔ارسطو کا یہ قول کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے اسی آفاقی حیثیت کی تلخیص ہے۔کلیتًا انفرادی زندگی ناممکن العمل ہے۔''(4)

انسانی تاریخ کے آغاز سے دیکھیں تو عورت کو دنیا کے ارتقائی عمل کی اساس کے طور پر برتری حاصل رہی ہے یہ تو مرد ہی تھی جس نے عورت کی اس قدر کو اپنی ترقی اور حکمرانی کی راہ میں رکاوٹ گردانتے ہوئے دبانے کی کوشش کی یا پھر اسے اپنی طرف منتقل کرنے کی سعی کی اور اس ضمن میں اُس نے اپنے اپنے مذاہب کی اوٹ میں پناہ تلاش کی، بقول سرکار جاچوری:

''ابتدائی انسانی معاشرہ میں دیوی کا وجود دیوتا سے پہلے دکھائی دیتا ہے اور مردوں کے گروہ نے ہی سب سے پہلے انسانی برادری میں عورت کے تقدس اور احترام کا بہ تقاضائے فطرت اہتمام کیا تھا۔عہدِ تاریخ کے آغاز سے مرد نے عورت کی تقدیس کو اپنی طرف منتقل کرنا شروع کیا۔ایسا کرنے سے اس نے قوت کے ساتھ ساتھ، مکروفریب اور حیلوں کو بھی استعمال کیا.....سلطان شمس الدین التمش نے تو بیٹوں پر اپنی بیٹی رضیہ سلطانہ کو ترجیح دی تھی اور وہی

باپ کے بعد ملکہ بنی اور کامیاب حکمران ثابت ہوئی لیکن احساسِ کمتری کا شکار مرد عہدیداروں نے بغاوت سے مزاحمت کی۔عورت کی مخالفت کے میدان میں ہم نے ہر اعتبار سے علمائے اسلام کو ہی دلیرانہ استحکام اور پامردی سے ڈٹے ہوئے پایا ہے۔''(5)

ہندوستانی معاشرہ اٹھارویں صدی میں مسلمانوں کی حکومت کے باوجود بڑی قوموں یعنی ہندو مسلم امتیازات سے زیادہ اشتراکات اور کلچر کے مشترک اساس کی نمائندگی کرتا ہے مگر اس میں بھی یہ تصور راسخ تھا کہ کنبے کا سربراہ مرد ہے، اس لیے گھر سے باہر مرد کی برتری قائم ہے۔ چنانچہ یہی تصور ہمیں اس عہد کے ادب میں بھی دکھائی دیتا ہے اور معاشرتی رویوں میں بھی جہاں عورت ناگزیر کردار بھی ہے اور مرد کے زیرِ نگیں بھی، گھر اور باہر کی زندگی دو مختلف دنیاؤں کا تصور رکھتی تھی۔ بقول زاہدہ حنا:

''شاعری، ادب، گالیوں، محاوروں اور ضرب الامثال کے وسیلے سے عورت کا ناقص العقل ہونا اور اس کی عیاری کے قصے نسل در نسل دہرائے گئے۔ یہاں تک کہ وہ صرف مردوں ہی کے نہیں عورتوں کے ذہن میں بھی راسخ ہو گئے اور خود انہوں نے اپنے آپ کو مردوں کی نسبت کم عقل، بزدل اور کم تر سمجھنا شروع کر دیا۔''(6)

مشرق میں اور خاص طور پر برصغیر پاک و ہند میں عورت کی آزادی کی تحریک دراصل جاگیرداری نظام کی زنجیر سے آزادی دلانے کی تحریک ہے۔عورت کو معاشرے کا فرد سمجھتے ہوئے تعلیم و تربیت کے مساوی مواقع، جائیداد میں قانونِ وراثت کے مطابق حصہ دیئے جانے اور معاشرے میں مناسب و مساوی مواقع ملنے کے لیے مغرب کی تقلید یا اس کی تہذیب کی دین نہیں بلکہ برصغیر میں اس شعور کو عام کرنے اور عملی کوششیں کرنے سے تعلق رکھتی ہیں جس کے لیے شہروں سے نکل کر دیہاتوں میں لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کے سکول کا قیام بھی ہے۔

عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں عورتوں کی رضا کارانہ کوششوں میں منہمک خواتین انجمنوں کا ذکر ناگزیر ہے۔ان انجمنوں کا مقصد عورتوں کی فلاح و بہبود کے کاموں کے علاوہ معاشرہ میں ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنا بھی ہے۔ عائلی قوانین کو ختم کرنے کی کوشش ناکام بنانے اور پہلی مرتبہ عورتوں کی انجمنوں نے عورتوں کے حقوق کے تحفظ کا پرچم بلند کیا اور پھر جس قانون یا مذہبی معنویت کے ذریعہ عورت کا درجہ کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان انجمنوں نے اس کا سنجیدگی سے نہ صرف جائزہ لیا بلکہ ان کے خلاف احتجاج بھی کیا۔عورتوں کی بیداری کے مسئلہ نے جب موجودہ سماجیات کے لیے چیلنج کی شکل اختیار کی تو ان ماہرین نے پھر

عورت اور اس کے وجود کو معاشرے میں توازن قائم رکھنے کے لیے سمجھنا اور سمجھانا شروع کر دیا، کشور ناہید کی ایک نظم ملاحظہ کریں جس میں ردِعمل کی ایک تصویر نظر آتی ہے:

یہ ہم گناہ گار عورتیں ہیں
جو اہلِ جبہ کی تمکنت سے نہ رعب کھائیں
نہ جان بیچیں
نہ سر جھکائیں
نہ ہاتھ جوڑیں
یہ ہم گناہ گار عورتیں ہیں
کہ سچ کا پرچم اُٹھا کے نکلیں
تو جھوٹ سے شاہراہیں اٹی ملے ہیں
ہرایک دہلیز پر سزاؤں کی داستانیں رکھی ملے ہیں
جو بول سکتی تھیں وہ زبانیں کٹی ملے ہیں
یہ ہم گناہ گار عورتیں ہیں
کہ اب تعاقب میں رات بھی آئے
تو یہ آنکھیں نہیں بجھیں گی
کہ اب جو دیوار گر چکی ہے
اُسے اٹھانے کی ضد نہ کرنا (7)

عورت کے معاشرے میں فعال کردار کے بارے ابھی تک بحث چل رہی ہے کہ عورت کے فعال ہونے سے سماجی، اقتصادی، نفسیاتی اور معاشرتی سطح پر تبدیلیوں کے جائزے کے بجائے ابھی تک میڈیا اور اخبارات میں یہی بحث چل رہی ہے کہ عورت گھر سے باہر کام کرے یا اس کا مقام صرف گھر تک ہے۔

جہاں تک پاکستان میں عورت کی ملازمت کا تعلق ہے تو سب سے زیادہ جس پیشے میں خواتین ہیں وہ تدریس کا ہے اس کے بعد ڈاکٹری کے پیشہ سے وابستگی کو فوقیت دی جاتی ہے جبکہ موجودہ دور میں مختلف دفاتر کی ملازمت کو بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا اسی لیے بینک، پی آئی اے، این جی اوز اور مختلف کمپنیوں کی ملازمت کو بھی

ہمارے متوسط طبقے کی لڑکیاں بآسانی قبول کر لیتی ہیں۔آج کل گھریلو یا کم تعلیم یافتہ خواتین نے چھوٹے چھوٹے کاروبار شروع کر دیئے ہیں جن میں لباس اور گھریلو ضروریات کی اشیاء کے علاوہ بیوٹی پارلرز قائم کر کے شوقیہ یا ضرورت کے تحت خود کو مصروف کر لیا ہے۔

خواتین کے مسائل کے اعتبار سے پاکستان میں جنوبی پنجاب کا علاقہ سب سے اہم ہے کیونکہ ان علاقوں میں خواتین اپنے بنیادی حقوق سے بھی محروم ہیں۔اس خطے میں خواتین کی آبادی کا بڑا حصہ دیہات سے تعلق رکھتا ہے جہاں کپاس چننے، گندم کاٹنے، کھیتوں میں سبزی چننے کے علاوہ وہ مویشی پالنے کا کام بھی کرتی ہیں ساتھ ہی گھر داری بھی بظاہر یہ خواتین آزادی سے گھومتی ہوتی ہیں لیکن ان کی قسمت کے فیصلے برادری سسٹم یا وٹہ سٹہ کی بنیاد پر کئے جاتے ہیں ایسے موقع پر عمر کا فرق نہیں دیکھا جاتا اور ایک گھر اجڑنے کی صورت میں دوسرے گھر کی بربادی لازم ہے۔دیہات کی نسبت شہر کی خواتین بھی رسوم و رواج کی قید میں ہیں جاگیرداری نظام میں جکڑے اس خطے میں عورتوں کے حقوق یا ان کی بہتری کے لیے کبھی کوشش نہیں کی گئی۔جمہوری نظام میں ایک امید کی جاسکتی تھی کہ ان علاقوں سے منتخب کردہ خواتین قومی وصوبائی اسمبلی کی ممبر ہوئیں یہاں تک کہ وزارت کے منصب پر بھی فائز رہیں لیکن وہ ابھی تک اپنے علاقے کی عورتوں کی فلاح کے لیے کوئی بڑا کام نہیں کر سکیں۔اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اسمبلیوں میں جانے والی خواتین کا تعلق بھی جاگیردار طبقے سے ہے، پاکستان کی مختلف سیاسی جماعتوں سے وابستہ خواتین رہنماؤں کی مثال لے لیں جن میں حنا ربانی کھر، عابدہ حسین، تہمینہ دولتانہ، شیریں مزاری، شازیہ مری، ماروی میمن اور عاصمہ ارباب عالمگیر کے علاوہ بہت سی خواتین کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ان خواتین نے اپنے علاقے کی فلاح و بہبود کے لیے وہی کام کئے جو کہ مرد حضرات کر رہے ہیں۔سڑکیں، پل، بجلی کے کھمبے اور اس طرح کے دیگر فلاحی کام کئے گئے حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس علاقے کی خواتین کے ہنر کو بہتر طریقے سے استعمال کیا جائے۔سرائیکی وسیب کی عورت کا مسئلہ تعلیم، ملازمت اور ان کے ہنر کی مناسب پذیرائی ہے۔اسی وسیب کی عورت اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی چیز کی مناسب مارکیٹنگ نہ ہونے کی وجہ سے سستی اجرت پر کام کرتی ہے۔روزگار کے مواقع بھی کم ہیں اور سرکاری ملازمت میں بھی انہیں مناسب حصہ نہیں ملتا۔یہ المیہ صرف جنوبی پنجاب کا ہی نہیں اندرون سندھ کا بھی ہے۔صوبہ سندھ سے بھی بہت سی خواتین قومی وصوبائی اسمبلی میں موجود ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق جاگیردار طبقے سے ہے یہ خواتین اسمبلی میں خواتین کے حق میں قوانین بنانے میں تو اہم کردار ادا کر رہی ہیں لیکن ان قوانین پر عملدرآمد کرنے کے لیے ان کی کوئی بھی عملی کوشش دکھائی نہیں دیتی۔یہ قوانین چاہے شرعی ہوں یا

پاکستانی عدالتوں کے لیے بنائے گئے ہوں ہر جگہ ان پر عملدرآمد روکنے یا اسے سست رو بنانے کے لیے بے شمار رکاوٹیں ہیں۔، عجیب بات ہے پہلی منتخب مسلمان وزیرِاعظم بے نظیر بھٹو کے بے رحمانہ قتل پر اقتدار میں آنے والی جماعت کی برسرآوردہ خواتین بھی اس حوالے سے کسی بڑی پیش رفت کی توفیق سے محروم رہیں، حتیٰ کہ اس صوبے میں بھی جہاں یہ جماعت برسرِ اقتدار ہے۔ سندھ میں ہی عورت کے مقام و مرتبہ کے حوالے سے پائی جانے والی صورتحال کے بارے میں عطیہ داؤد کی یہ رائے بھی اہم ہے کہ:

> ''سندھی عورت کی کہانی بھی اتنی ہی المناک ہے جتنی کسی بھی ترقی پذیر سماج کی عورت کی ہوسکتی ہے۔ اگر کوئی فرق نظر آئے گا بھی تو اس سماج کے معاشی ڈھانچے، طبقاتی امتیاز، مقامی عقائد اور رسومات کی بنیاد پر ہوگا۔
>
> سندھی عورت کے ماضی کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو موہنجوداڑو کی صاف ستھری گلیوں میں آزاد اور کھلی فضاؤں میں خوشیوں کا رقص کرتی ہوئی، اعتماد کے ساتھ دنیا کو دیکھتی ہوئی عورت نظر آتی ہے۔ آج وہ عورت مورتی کی صورت میں یا عجائب گھروں میں یا دانش وروں کے ڈرائنگ روم میں سجی ہوئی نظر آتی ہے۔''(8)

جنوبی پنجاب کی طرح سندھ میں بھی جاگیرداری نظام ہے اور اس سسٹم کی ہیبت کو عورت کے استحصال کی غیر انسانی صورتِ حال کبھی کاروکاری، کبھی ونی، کبھی وٹہ سٹہ اور کبھی اجتماعی زیادتی کو غیرت قرار دے کر قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، یہی نہیں عورت کے استحصال میں کارفرما مردانہ ملکیتی سماج کی سوچ کا محور وہی جائیداد ہے سے، جس سے حتی الوسع عورت کو محروم ہی رکھا جاتا ہے، چاہے جاگیردار گھرانے اپنی املاک بچانے کے لئے اپنی بیٹیوں کی نمائشی شادیاں قران سے ہی کیوں نہ کردیں، حقِ مہر کو بھی شادی کی اولیں شب معاف کرانے کو مردانہ شان خیال کیا جاتا ہے، یہی نہیں، عورتوں کے لئے علاج معالجے کی سہولت کو بھی کئی عشروں تک ٹالا گیا ہے' اونٹنی' کی رسم یا جن نکالنا تو عام روش ہے، جس کی آڑ میں عورتوں پر بدترین تشدد کیا جاتا ہے۔ جاگیرداری اور قبائلی نظام کی سنگینی تعلیم یافتہ عورت کے تصور سے لرزہ براندام رہتی ہے، اس لئے تعلیم سے محرومی کو بعض علاقوں کی عورت کا مقدر بنایا گیا، آخر لڑکیوں کے مدرسوں کو بم سے اڑا دینا طالبان کا اضطراری فعل تو نہیں، یہ جہاں ایک قبائلی ذہنیت کو ظاہر کرتا ہے، وہاں دینِ متین کے جوہر کو انسانیت کے لئے ایک خوش خبری ہونے سے روکنے کی کوشش بھی، اس صورتِ حال پر کشور ناہید نے ایک لازوال نظم 'طالبان سے قبلہ رُو گفتگو' لکھی ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عورت کے استحصال کی

بجائے شاید یہ عورت کی فتح ہے کہ جنت کی تلاش کی بات کر کے اپنی اس دنیا کو دوزخ بنانے والے یہ لوگ نہتی لڑکیوں سے بھی ڈر گئے کہ وہ تعلیم حاصل کر کے ان پر تفوق نہ پا جائیں سو اس طوفان کے آگے بند باندھنے کے لیے اُن کے ا سکولوں اور کالجوں کو دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا تا کہ آئندہ نسل کی عورت پر تعلیم کا دروازہ بند کر کے اُس کا مستقبل تاریک کیا جا سکے۔

پنجاب میں دیکھا جائے تو خاص طور پر شہری پنجاب میں لڑکیوں کی تعلیم کا دوہرا معیار ہے، یعنی روساء اپنی بیٹیوں کو انگریزی میڈیم سکولوں میں تعلیم دلاتے ہیں جبکہ عام گھروں کی لڑکیوں کے لیے بسا اوقات تعلیم کے دروازے ہی بند ہیں۔ سندھ اور بالخصوص اندرون سندھ کی صورت حال دیکھی جائے تو وہاں بھی حالات اس سے بہت مختلف نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود عطیہ داؤد کو توقع ہے کہ رفتہ رفتہ سندھی عورت تک کا مقدر بدل سکتا ہے، وہ لکھتی ہیں کہ:

> ''اس پس منظر سے آئی ہوئی کٹھن راستوں پر چلتی ہوئی ہماری سندھی عورت بڑی مشکل سے یہ سفر طے کر پائی ہے کہ مہتاب اکبر راشدی اور نور الہدیٰ شاہ کے روپ میں اپنے ملک میں اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر پہچان کروا سکے ورنہ مجموعی طور پر ادب، صحافت، سیاست، تعلیم، سوشل ورکر، سائنس اور ٹیکنالوجی، آرٹ کے میدان میں ہماری سندھی عورت اپنے ملک کی عورتوں سے بہت پیچھے ہے۔ ہم ابھی تک اپنے چھوٹے سے کارنامے پر بھی روشن خیال مردوں سے بچوں کی طرح داد وصول کرتے ہیں کہ سندھی عورت ہوتے ہوئے کمال کر دیا ہے۔''(9)

۱۹۹۸ء کی مردم شماری کے مطابق دس برس سے زائد کے عمر کے ۹. ۴۳ فی صد پاکستانی خواندہ ہیں، ۸. ۵۴ فیصد مردوں کے مقابل محض ۳۲ فی صد خواتین (۸) یہ اعداد و شمار بہت سی ان کہی کہانیاں سناتے ہیں۔

پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے جہاں اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ مرد و عورت کے حقوق و فرائض اسلام کی روشنی میں طے کئے جائیں گے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

> ''لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا''(10)
>
> ''مردوں کو ان کے کاموں کا ثواب جو انہوں نے کیے۔ اور عورتوں کو ان کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کیے اور خدا سے اُس کا فضل و کرم مانگتے ہو، کچھ شک نہیں کہ خدا ہر چیز سے واقف ہے۔''

زمانۂ جاہلیت میں عورت سے جینے کا حق چھین لیا جاتا تھا۔ بیٹی کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا، سورہ تکویر کی آیت یاد کیجئے:

"وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ. بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ" (11)

''اور جب اس لڑکی سے جو زندہ دفنادی گئی ہو پُوچھا جائے گا، کہ وہ کس گناہ پر ماردی گئی؟''

یوں اسلام نے پہلی مرتبہ عورت کو جینے کا حق دیا, بیٹی کو رحمت قرار دیا۔

اور اسلام ہی نے عورت کو سب سے پہلے رائے دینے کا حق بھی دیا۔ بخاری کی روایت کے مطابق حضرت بریرہؓ کو حضرت عائشہؓ سے لونڈی ہونے سے آزادی مل گئی تو انہوں نے شرعی اصول کے مطابق مسخ نکاح کا اختیار استعمال کرتے ہوئے ایک نوجوان مغیثؓ نے علیحدگی اختیار کر لی۔ حضور اکرم ﷺ سے مغیثؓ نے سفارش کی کہ میری بریرہؓ سے صلح کروادیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ اس کا حق ہے میں کیا کرسکتا ہوں۔ اب مغیثؓ مختلف لوگوں سے سفارش کروا رہے ہیں تا کہ بریرہؓ سے صلح ہو جائے۔ عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ میں نے دیکھا کہ مغیثؓ گلیوں میں روتا ہوا بریرہؓ کے پیچھے پھر رہے ہیں اور ان کے آنسو ڈاڑھی پر بہہ رہے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس کی محبت دیکھو کہ گلیوں میں رو رہا ہے اور وہ اس کا نام نہیں سننا چاہتی۔ مغیثؓ کی درخواست پر آپ ﷺ نے بریرہؓ سے بات کی تو انہوں نے کہا کہ میں نے اسے چھوڑ دیا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ گلیوں میں روتا پھر رہا ہے تو بریرہؓ نے کہا کہ میں نے اپنا حق استعمال کیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرسکتی ہو۔ آخر وہ تمہارے بچوں کا باپ ہے۔ بریرہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ مطلب یہ تھا کہ اگر حکم ہے تو کسی مسلمان کی کہا مجال ہے کہ حکم نہ مانے۔ آپ ﷺ نے فرمایا مشورہ ہے حکم نہیں تو فوراً ''لا حاجۃ لی'' پھر مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ (12)

گویا کہ اسلام عورت کو ایسا حق دیتا ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کا مشورہ قبول نہیں کرتی اس کے بعد بریرہؓ اسی گھر میں رہتی ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے پھر بات کبھی دہرائی بھی نہیں کہ بریرہؓ تم نے میری بات نہیں مانی۔

ماں کی حیثیت باپ سے تین درجہ زیادہ قرار دی گئی اور فرمایا کہ:

"خیارکم خیارکم لاھلہ" (13)

''تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر ہے'' اور مرد شوہر کو بیوی کے نان نفقہ کی ذمہ داری سونپی گئی، حقِ مہر کو واپس لینے سے منع کیا۔ خانگی تعلق کو سنوارنے کی ہدایت کی ''رشتہ وقرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو اور یقین کرو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے'' (14)

خلاصہ کلام:

تاریخ اسلام بھی گواہ ہے کہ مسلمان عورتوں نے کس طرح جرأت، بہادری، تدبر اور اعلیٰ کردار سے خود کو منوایا۔ حضرت خدیجہؓ، حضرت فاطمۃ الزہراؓ، حضرت زینب، فاطمہ بنت عبداللہ اور بے شمار خواتین ہیں جنہوں نے اپنی سادگی، قناعت، صبر و تحمل، جرأت اور بہادری کے ذریعے تاریخ میں نام پیدا کیا لیکن ہمارے معاشرے میں عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے اور عام گھریلو زندگی میں اس کے استحصال کی کیا کیا صورتیں ہیں اس طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں، جو اپنی جگہ سماجی مفکرین کے روبرو ایک اہم سوال ہے۔

اکیسویں صدی کی پسماندہ اور ظلم کی چکی میں پسنے والی عورت کے لیے جہاں ایک طرف ریاست کچھ قوانین کے اطلاق کی کوششیں کر رہی ہے وہیں شہری علاقوں کی پڑھی لکھی عورتیں بھی آواز بلند رہی ہیں خواہ وہ انفرادی سطح پر ہو یا پھر کسی ادارے کے ساتھ انسلاک کی صورت میں، عورتوں میں بھی وہ طبقہ جو بیرونِ ملک سے تعلیم حاصل کر کے اپنے وطن واپس آتی ہیں، یہاں کی فضا میں بھی ویسی ہی تبدیلی کی خواہش لیے ہوئے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کی ترقی نے ابلاغ کو تو تیز ترین بنایا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ کیمرے کی آنکھ ایک علاقے کے باشندوں کو دوسرا علاقے کی صورتحال سے آگاہ کرنے میں بے حد معاون ثابت ہوئی ہے۔ پاکستان کے پسماندہ خطوں جیسے اندرون سندھ اور جنوبی پنجاب کے کچھ علاقوں وغیرہ کے بارے میں حال ہی میں کئی ایسی ڈاکومنٹریز منظرِ عام پر آئی ہیں جنھوں نے یہاں کی عورت کے مسائل کو اجاگر کرنے اور حکومتی ایوانوں تک اُن کی آواز پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا بلکہ اس سے بڑھ کر گذشتہ دنوں پاکستان کی آسکر ایوارڈ یافتہ خاتون شرمین عبید چنائے کا کارنامہ مثال بن سکتا ہے جس نے جنوبی پنجاب کے ضلع مظفر گڑھ، ڈی جی خان اور راجن پور کے علاقوں میں عورتوں پر تیزاب پھینکے جانے کے ظالمانہ اقدام کو ایک ڈاکومنٹری Saving Face کے ذریعے پوری دنیا تک پہنچایا۔ یہاں کی عورت پر یہ ظلم آج سے نہیں بلکہ کئی برسوں سے جاری تھا لیکن یہ صرف اکیسویں صدی کی سائنسی ترقی اور میڈیا کے تیز رفتاری کے باعث ممکن ہو پایا کہ ظلم کی یہ داستان دنیا کو مہذب بنانے کا خواب دیکھنے والے ایوانوں تک بھی پہنچی۔ ایسی کاوشیں ہی ہیں جو ستم زدہ عورت کو اُس کا سماجی مقام و مرتبہ دلانے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنی زندگی جینے کا پورا حق دلانے میں نمایاں کردار ادا کر سکتی ہیں۔

حوالہ جات

1۔ صحیح بخاری ج1،ص869

2۔ ایضاً، ج دوم،ص783

3. Todd, Janet, Fiminist Literary History,1991, New York, Routledge, P.56

4۔ عائشہ بیگم، تاریخ اور سماجیات، ۱۹۹۹ء، لاہور، پرنٹ لائن پبلشرز، ص۲۳

5۔ جاچوری، سرکار ذینی، مادرِ کائنات (حصہ دوم)، س۔ن۔ کراچی، شاہکار بک فاؤنڈیشن، ص۸، ۹

6۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، س۔ن، کراچی، شہزاد، ص۲۶۲

7۔ کشور ناہید، فتنہ سامانیٔ دِل، س۔ن۔ لاہور، سنگِ میل، ص۳۴۵

8۔ عطیہ داؤد، سندھ کی عورت: سپنے سے سچ تک، ۲۰۰۲ء، کراچی، شہزاد، ص۱۳

9۔ ایضاً، ص۱۹

10۔ النساء:32

11۔ التکویر:8,9

12۔ بخاری حدیث نمبر 4875، ابوداؤد حدیث نمبر 1904

13۔ بخاری جلد دوم

14۔ النساء:1